ڈاکٹر حمیرا اشفاق
استاد شعبہ اردو،بین الاقوامی اسلامی یو نیورسٹی ،اسلام آباد

"اصلاح النساء" انیسویں صدی کے جدید فکری رویوں کا اعلامیہ

Dr.Humaira Ishfaq,
Chairperson Center of excellence for modern languages (CEML), International Islamic University Islamabad.

"Islah-un-Nissa: the declaration of 19th.cetury's modern thoughts".

In this paper, I have tried to explore the situation of 19th century women of colonial India, through the first Urdu novel- Islahun-Nisa by a female writer Rasheedun – Nisa. On contrary to Sir Syed Ahmad Khan and other contemporary male reformists, she advocated women's education and opposed customary rituals of her time. She also spoke for women's reforms, (the literal meanings of Islahun-Nisa) but did not suggest the segregation of women from society as her male contemporary reformists tried to pose. She has linked all superstitions of her time with lack of education. She has knitted her concepts of modernity and education in the story of novel like a master craft person.

اردو کی پہلی خاتون ناول نگار ''رشیدۃ النساء'' کا ناول اصلاح النساء ۱۸۸۱ء میں تصنیف ہوا لیکن اس کی اشاعت سات سال بعد ۱۸۸۸ میں ممکن ہو سکی۔ناول جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس میں خواتین کی اصلاح کے پہلو کو مدِ نظر رکھا گیا لیکن یہ اصلاح اس دور کے روایتی تصور سے یکسر مختلف ہے۔خواتین کی اصلاح کا نعرہ اس دور سے لے کر آج تک گونج رہا ہے جبکہ ادب، تاریخ اور تہذیب اور اس کے علاوہ تمام سماجی علوم میں ''اصلاحِ مرداں'' کا اصرار کہیں دکھائی نہیں دیتا۔انیسویں صدی میں ہندوستانی منظر نامے پر خواتین کے حوالے سے کئی مباحث جنم لے رہے تھے۔جن میں سے ایک تصور سر سید احمد خان کا بھی ہے جسے برہمنی تصور کا شاخسانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا جس کے مطابق عورتوں کو جدید تعلیم دینا گویا کوئی مضر اوزار ہاتھ میں پکڑانے کے مترادف ہے۔

> ''تعلیم نسواں کی ہندوستان میں ابتدا ہو چکی تھی اور سر سید کو انگریزوں سے ربط خاص بھی تھا،اس کے باوجود عورتوں کی تعلیم کے بارے میں لارڈ ڈلہوزی، سر ولیم میور، ڈیوڈ ہیر،لیڈی

> ایمہرسٹ اور لیڈی فریزر کے رویوں اور احکامات کو بھی خاطر میں نہیں لائے۔ تعلیم نسواں کی وہ تحریک جا باثر انگریزوں نے ۱۸۲۴ء سے شروع کی تھی جسے ۱۸۵۰ء میں لارڈ ڈلہوزی کی سرپرستی حاصل ہوئی اور ۱۸۵۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے جس تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے ایجوکیشنل ڈسپیچ جاری کیا، اس سے سرسید کو اس قدر اختلاف اور اکراہ رہا کہ انھوں نے ۱۸۸۹ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے اجلاس میں تعلیم نسواں کے حوالے سے پیش ہونے والی قرارداد کی کھل کر مخالفت کی۔"(۱)

انگریزوں نے خواتین میں تعلیم کا شعور اجاگر کرنے کی کاوشیں کیں لیکن مسلم خواتین کے لیے بے پردگی کو بنیاد بنا کر یکسر مسترد کر دیا گیا۔ تعلیم نسواں کے فروغ کے لیے انعامی کتابوں کا بھی سلسلہ شروع کیا گیا جن میں ڈپٹی نذیر احمد کی "مراۃالعروس" اور "بنات النعش" مولوی کریم الدین کی "تذکرۃ النسا" محمد حسین خاں جج کی "تہذیب نسواں" محمد ظہر الدین خاں کی "تعلیم نسواں"، نیاز علی کی " انشائے تمیز" اور عبدالحامد کی "مفید النساء" بھی انعام یافتہ کتابوں میں شامل تھیں۔(۲)

پردے کی ذیل میں بات کی جائے تو ایک اعلیٰ طبقے سے تعلق رکھنے والی خواتین پر بھی تلا تخصیص نام تک کا پردہ واجب تھا جس کی ایک مثال رشیدۃ النساء کا نام نہ لکھنا بھی ہے۔ زاہدہ حنا اپنے مضمون """رشندری، رشیدہ اور رقیہ کا خواب" میں لکھتی ہیں کہ

> "برطانوی ہندوستان میں اقتدار سے جڑا ہوا رہا، کئی شمس العلما، کئی خان بہادر اور کئی نائٹ ان کے بھائی، بھتیجے اور داماد تھے۔ جدید تہذیب کی روشنی ان کے خاندان کے زنان خانے میں تو نہیں آئی لیکن اس کا عکس زنان خانے میں پو پھٹنے کا ملگجا اجالا ضرور پھیلا تا رہا"۔ (۳)

ایسے میں رشیدۃ النساء کے کردار بھی اسی بحث میں الجھے مکالموں کو جنم دیتے ہیں۔ جس میں ایک طرف تعلیم کی اہمیت ہے تو دوسری طرف رسوم و رواج کا وہ پہاڑ ہے جس کا سر کرنا گویا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

مصنفہ نے زنان خانے میں پھیلی توہمات اور ان کے نتیجے میں پھیلنے والے اضطراب کو جہالت کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہانی کو بڑے سلیقے سے آگے بڑھایا ہے۔ ناول میں کہیں کہیں اصلاح کے لیے تبلیغی انداز بھی اپنایا گیا لیکن فرسودہ رسموں کو جزئیات کے ساتھ بیان کرنے کی وجہ سے کہانی کا منظر نامہ دھندلا نہیں پڑتا بلکہ کردار اپنے رویوں کے ساتھ جلوہ گر ہو جاتے ہیں۔ مثبت کرداروں کو کہانی میں "پڑھی لکھا" اور منفی کرداروں کو 'جاہل" یا "ان پڑھ" کہہ کر متعارف کروایا گیا ہے، جس سے اول الذکر قیاس کو تقویت ملتی ہے کہ توہم پرستی کی طرف وہی عورتیں مائل نظر آتی ہیں جو تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ کہانی میں مرکزی کردار بسم اللہ اور اس کے شوہر امتیاز الدین کا ہے جن کے ارد گرد کہانی کا تار و پود بُنا گیا ہے۔ یہ دونوں چچازاد ہونے کے باوجود اپنی اپنی ماؤں کی تربیت کی وجہ سے الگ الگ مزاجوں کے حامل ہوتے ہیں۔ امتیاز الدین کی ماں پڑھی

لکھی اور سمجھدار عورت تھی وہ شوہر کی خواہش پر راضی ہوتے ہوئے، بسمہ اللہ کی ماں کے ترش و تلخ رویے اور مزاجوں کے فرق کو جاننے کے باوجود اس شادی کے لیے راضی ہو جاتی ہیں۔ انہوں نے بچپن سے ہی اپنے بیٹے کے ذہن میں علم کی اہمیت اجاگر کی تھی۔

"مکتب میں جانے کے لیے نہایت نرمی سے تاکید کرتیں،۔۔۔۔ اکثر کہتیں کہ بیٹا علم بڑی دولت ہے، روپیہ پیسہ اس کے سامنے کچھ نہیں ہے، پڑھنے لکھنے کے یہی دن ہیں، علم حاصل کرنے کا یہی سن ہے۔ سنو جو بد شوق لڑکا پڑھتا لکھتا نہیں

ہے، دن رات کھیل تماشے میں رہتا ہے، وہ جوانی اور بڑھاپے میں بہت پچھتاتا ہے، مگر اس کا پچھتانا اس وقت کچھ کام نہیں آتا ہے۔ جب تم کو چار بجے فرصت ملتی ہے اس وقت سے شام تک میری نظر کے سامنے کھیلا کرو میں منع نہیں کرتی مگر صبح سے چار بجے تک خوب دل لگا کر پڑھا لکھا کرو"(۴)

اگر وہ بسم اللہ کے حوالے سے کسی بات کا اعتراض بھی اٹھاتی ہیں تو صرف اس کا" ان پڑھ" ہونا۔ مروجہ روایت سے ہٹ کر یہ ایک نیا طرزِ فکر تھا جسے مصنفہ معاشرتی رویوں میں جذب کر کے ایک صحت مند معاشرے کو عملی صورت دینا چاہتی تھیں۔

> دولت یا صورت یا شکل پر تم نہ جاؤ، کیا صرف دولت اور صورت ہی کا خیال ہونا چاہیے، یا لڑکی کا تعلیم یافتہ ہونا بھی کوئی چیز ہے۔ (۵)

خواتین کے لیے تعلیم کی اہمیت اور ضرورت کے حوالے سے کئی جگہ نفسِ مضمون باندھا گیا ہے۔ دوسرا اہم کردار بسمہ اللہ کی ماں کا ہے جس کا تعارف ناول نگار کچھ اس انداز میں کرواتی ہیں کہ اس کردار کے ذہنی رویوں کو با آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اس کردار کی توہم پرستی کی وجہ ابتداء میں ہی بیان کر دی جاتی ہے جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ "ان پڑھ" ہے اس لیے وہ دین اور دنیا کو بلا سوچے سمجھے خراب کیے جاتی ہے۔ بسمہ اللہ بھی ان پڑھ ہے کیونکہ اس کی ماں نے اس کی تعلیم تو کیا درست تربیت کا اہتمام بھی نہیں کیا۔ ان دونوں باتوں سے براہِ راست مصنفہ کا نظریہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ایک پڑھی لکھی ماں ہی صحت مند ذہن رکھنے والی نسل پیدا کر سکتی ہے۔ یہ خیال سر سید احمد خان کے خواتین کی تعلیم پر مردوں کی تعلیم کو فوقیت دیے جانے کی مدلل نفی کرتا ہے۔ ذیل میں درج دونوں اقتباسات اس ضمن میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

"بی بی کی جہالت کا یہ حال تھا کہ قرآن شریف تک نہیں پڑھ سکتی تھیں۔۔۔۔ اگر روزہ رکھا بھی جاتا تھا تو سوا پہر کا روزہ، حضرت مشکل کشا کا یا خواجہ خضر یا بی بی آس یا بی بی نور کا، اور بہت سے روزے جو شروع سے بالکل ناجائز ہیں۔ دن رات بی بی پیر کھلایا کرتیں اور پیر اس کثرت سے تھے کہ خدا کی پناہ۔ شیخ سدو، زین خان، شاہ دریا، شاہ سکندر، نقتو جنات، لال شہزادہ، ننھے میاں، جعفر جن، خونی شہید، لال پری، سبزی پری، خونی پری، تغار پری، چھوٹے صاحب بڑے صاحب، ان کے علاوہ اور بہت سے پیر تھے جو ان پر کھیلا کرتے تھے، بی بی کو جب ماما اصلیوں کی لڑائی سے فرصت ہوتی تھی تو

بیٹھک اور پیروں کے سامان میں مشغول ہوتیں، پیروں کے واسطے طرح طرح کے جوڑے تیار ہوتے، امیر گھر کے پیر تھے، ایسے جیسے سامان سے کب راضی ہونے والے تھے"(۶)

بیٹی کی تربیت بھی اسی انداز میں کی جس سمجھ بوجھ کی وہ حامل تھیں۔ تعلیمِ نسواں کے فروغ میں رشیدۃ النساء اپنا مؤقف بہت وضاحت کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔ بچے کی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کی ذمہ داری بھی ہندوستانی سماج میں صرف ماں پر ڈالی جاتی ہے۔ اسی ذہنی رویے کی عکاسی ناول میں مکالموں کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔

"بی بی رات دن اسی دھن میں رہتی تھیں، اپنی بیٹی بسم اللہ کی نہ تعلیم کا ان کو خیال تھا اور نہ اس کی طرف کچھ توجہ کی۔۔۔ پڑھانے لکھانے کا تو کیا ذکر، کوئی ڈھنگ سکھانے والا بھی نہ تھا۔۔۔ اگرچہ محمد معظم نے بہت چاہا کہ لڑکی پڑھے اور ڈھنگ سیکھے، مگر جب ماں کی توجہ نہ تھی ان کی کوشش کیا بہ کار آمد ہوسکتی تھیں۔"(۷)

عورت جسے صرف مذہبی علوم تک محدود رکھا گیا اور یہ بات یقین سے کہی بھی جاسکتی ہے کہ نو آبادیاتی ہندوستان میں موجود مسلم خواتین کی نصف سے زائد آبادی اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور ہوں گی۔ یا یوں کہا جا سکتا ہے کہ بنیادی تعلیمات تو مذہب کی لازمی سمجھائی جاتی ہوں گی۔ لیکن اس سب کے باوجود خواتین میں حد سے بڑھا ہوا توہم پرستی کا رویہ، زائد رسوم و روج کی پابندی اور روزمرہ کی زندگی میں دکھاوا وغیرہ جیسی بدعتیں کیونکر اختیار کی گئی ہوں گی۔ اگر اس دور کا معاشرتی رویہ دیکھا جائے تو اس میں ذہنی گھٹن جس کے نتیجے میں منفی رویے اس سارے عمل کا اصل سبب ہیں کہ جہاں دباؤ یا حد سے زیادہ پابندیاں صحت مند سوچ کی راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ رشیدۃ النساء اپنے دور کا روشن خیال ذہن تھیں جنہوں معاشرے میں پھیلتے ان منفی رجحانات کو روکنے کے لیے قلم اٹھایا۔ تا کہ اس طرح کی بدعتوں کو روکا جاسکے۔

مذکورہ ناول میں مصنفہ کئی جگہوں پر عورتوں کی توہم پرستی کو موضوع بناتے ہوئے شادی بیاہ میں گایا جانے والا ایک گیت بطور نمونہ درج کرتی ہیں جو اس وقت کے ذہنی ضعف کی تصویر کشی کرتا ہے۔

"کوٹھے بیٹھے اللہ میاں چھجے بیٹھے سبحان اللہ میرے دل میں سبحان اللہ پھر سہرا باندھیں اللہ میاں کنگنا باندھیں سبحان اللہ"(۸)

"کریم النساء آہستہ سے بولیں کہ جب تم کو دین و ایمان کی خبر نہیں تو اللہ میاں کو کوٹھے پر بٹھاؤ، جو چاہو بناؤ اور جا کر سو رہیں"(۹)

منتوں مرادوں کا یہ عالم تھا کہ اس اسلامی تعلیمات میں جن میں ان کا مذکور بھی ممکن نہیں وہ گھروں کے اندار عام رواج پا چکی تھیں۔ اس کی ایک بنیادی وجہ سہولیات کا نہ ہونا اور دوسرا وہ جہالت کی گھٹن جو ہمیں کہانی کے اوراق میں جا بجا نظر آتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ مصنفہ مکالموں کی شکل میں غلط صحیح کا فرق واضح کرنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔

"مجھے شامت جو آئی تو حضرت بڑے پیر کا طوق مانا، اس منت کی برکت سے اچھا ہو گیا، میں نے طوق بنوایا، گیارہ پسیری کھانے پکوائے اور خوش خوش طوق لے کر گئی، پہننا تو درکنار اس نے الٹے مجھ کو نصیحت کرنا شروع کی اور کہنے لگا کہ منت ونت ماننا واہیات ہے۔ بے وقوف لوگ منت مانا کرتے ہیں، اس سے کیا ہوتا ہے"(۱۰)

مندرجہ ذیل اقتباس سے مردانہ ذہنیت کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ کس طرح عورت کے لیے توہمات کا جال بنا جاتا ہے کہ وہ کم عقل ہے یا کوئی غلطی مرد سے بھی سرزد ہو رہی ہے تو بھی وہ عورتوں سے منسوب کرتے ہوئے بطور ایک خامی کے ذکر کی جاتی ہے۔

"ہنس کر یہ سب محض افترا ہے، اصل یہ ہے کہ عورتوں کے کل عقائد نہایت ہی مضر اور خراب ہوتے ہیں، اکثر معمولی عقل کے مرد بھی عورتوں سے ملتی جلتی عقل رکھتے ہیں"(۱۱)

نو آبادیاتی ہندوستان میں عورت اور مرد دونوں کے لیے بلا تخصیص انگریزی علاج کو بُرا سمجھا جاتا تھا۔ لیکن خواتین کے لیے تو قطعی ممنوع قرار دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں زچگی کی اموات، ہسٹیریا اور کئی طرح کی دوسری بیماریوں کو بھوت پریت کا سایہ اور دیگر اس طرح کے حادثات کو بد شگونی کہہ کر عورت ٹونے ٹوٹکوں کی طرف مائل ہوئی۔ "اصلاح النساء" میں بھی گھریلو عورتوں کی توہم پرستی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ جہاں چیچک جیسی مہلک بیماری کو کئی طرح سے قابو کرنے کا جتن نظر آتا ہے۔

"آج کل جاہل عورتوں کی بدلتا اچھے اچھے گھروں میں چیچک جو ایک بیماری مثل اور بیماروں کے ہے، پوجی جاتی ہے۔ جب چیچک کسی لڑکے کو دیکھائی دیتی ہے، ماتا میا نام رکھا جاتا ہے۔ لڑکے کا نام لے کر پکارنا منع ہو جاتا ہے، کیا مجال کہ کوئی نام لے کر پکارے، سب لوگ ماتا میا کہہ کے پکارتے ہیں۔ شام کو راہ ٹھنڈی کی جاتی ہے، کوئی شخص پانی گراتا ہوا دروازے سے باہر تک جاتا ہے، بہت سی ایسی چیزوں کا پرہیز جو کہ ہندوؤں کے ہاں ہوتا ہے، مسلمانوں کے ہاں بھی کیا جاتا ہے، جیسے دال وغیرہ کا نہ بگھارنا، گدھے کو چنے کھلانا، مالنوں کو بلا کر بھجن گوانا، گنگا پوجا کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے اور آخر کو ماتا پوجنے کی نوبت آتی ہے۔"(۱۲)

اس طرح کے کئی دیگر اقتباسات حاشیہ میں شامل کر دیے گئے ہیں تاکہ سماجی تناظر میں اس صورتِ حال کو مزید واضح انداز میں سمجھا جا سکے جس کا ذکر رشیدۃ النساء نے کیا ہے۔ ان کے ناول میں براہ راست کسی بڑی تبدیلی کا نعرہ نہیں لگایا گیا لیکن ناول نگار نے معاشرتی بگاڑ کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے عورت کی گھریلو زندگی کے اوپر منڈلاتے جہالت کے سایوں کو دور کرنے کا عندیہ دیا ہے۔

"اکثر عورتیں دن رات وہم کی پتلا بنی رہتی ہیں، ہزاروں ٹونے ٹوٹکے کرتی ہیں، گناہ کا گناہ الگ اور روپے کی بربادی الگ اور فائدہ خاک بھی نہیں"(۱۳)

”سب رسمیں ان کے دیوتاؤں کے نام سے انجام پاتی ہیں اور مسلمانوں میں پیر پیغمبر اولیاء اللہ کے نام سے ہوتی ہیں، ان سب رسومات سے مواخذہ عقبیٰ کے علاوہ دنیاوی ضرر جو ہوتا ہے وہ کیا کم ہے، خیال فرمایئے کہ بیماریوں میں بجائے علاج کے ہزاروں روپے دعا تعویذ، جادو سحر، جھاڑ پھونک، فال رمل میں برباد ہوتے ہیں، جو حق ڈاکٹر اور حکیم کا ہے وہ فریبی ملاؤں کی نظر ہوتا ہے“(۱۴)

اصلاح النساء کی مصنفہ پر مولوی نذیر احمد کے ناولوں کی گہری چھاپ نظر آتی ہے، انہوں نے مرآۃ العروس سولہ برس کی عمر میں پڑھا اور وہیں سے متذکرہ بالا ناول کی بنیاد پڑی۔ اس دور میں رشیدۃ النساء کے ہاں بھی وہی فکری رویہ نظر آتا ہے جس کے تحت مردوں کی دی گئی تعلیمات کو عورت اپنا دین ایمان سمجھتے ہوئے اس پر من و عن یقین بھی رکھے۔ اس میں شک نہیں کہ عورت کو اس کے فرائض تو احسن طریقے سے طوطے کی طرح رٹوائے گئے لیکن اسے اس کے حقوق کی بھنک تک نہ پڑنے دی گئی، جن میں وراثت کا حق، تعلیم کا حق، دوسری شادی کی اجازت کا حق وغیرہ شامل ہیں۔ بسم اللہ کی ساس ایک رشتہ دار سے گفتگو کرتے ہوئے دکھائی گئی ہیں، جس سے مندرجہ بالا نکتے کی وضاحت ہو جاتی ہے۔

”احمد کی بھاوج: اے ہے ان بیبیوں کا کیا ہے جو پڑھی نہ لکھی نہ کبھی بے چاریوں نے مردوں سے ریت رسم کی برائی بھلائی عمر بھر سنی، وہ جو کچھ نہ کریں تعجب ہے، ان کا ذکر تو جانے ہی دیجئے“(۱۵)

رشیدۃ النساء، صرف مرض کی تشخیص ہی نہیں کرتیں بلکہ اس کا حل بھی تلاش کرتی ہیں اور اپنی ہی سوسائٹی کے مردوں سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھتی ہیں کہ

> ”۔۔۔۔۔۔اگر آپ ہی لوگ اپنے اپنے گھروں میں عورتوں کی اچھی تعلیم کرتے تو آج کے دن اتنے روپے بیکار کیوں برباد کرتے۔ اب سب واہیات باتیں اس طرح پر عورتوں کے دل میں جمی ہوئی ہیں کہ ان کا مٹانا بھی مشکل ہے، کسی کے سمجھانے سے کوئی نہیں مانتا ہے“(۱۶)

مرد ناول نگاروں نے بھی عورت کے مسائل کو بیان کیا ہے لیکن جس قدر گہرائی سے اس دور کی عورت تخلیق کار نے زنان خانوں کے دروزاں پر پڑے موٹے ٹاٹ کے پردوں سے جھانکنے کی کوشش کی ہے وہ اپنی جگہ قابلِ ذکر ہے۔ رشیدۃ النساء نے اپنے ناول میں دو طرح کی خواتین کو موضوع بنایا ہے ایک وہ جو تعلیم (غیر رسمی تعلیم) سے بہرہ مند ہے اور دوسری جسے لکھنے پڑھنے سے کوئی سروکار نہیں رہا۔ یہ دونوں کردار دراصل اصغری اکبری کی ہی ایک شکل ہے۔ لیکن ان کرداروں کی اُٹھان میں پورا معاشرہ اپنی جزئیات کے ساتھ سانس لیتا نظر آتا۔ اس طرح ’اصلاح النساء‘ کے نسوانی کردار جیتے جاگتے ،زندگی سے قریب ہو کر مثالیت پسندی کے عیب سے بچ جاتے ہیں۔ کہانی ابتدائی صفحات میں اپنے مؤقف کے ساتھ آگے بڑھنے لگتی ہے، لیکن پھر ایک شادی کا منظر ناول میں داخل ہوتا ہے لیکن وہ رسموں رواجوں کی ایک ایسی تفصیل ہے جو تقریباً ناول کے سو سے زائد صفحات تک پھیل جاتی ہے۔ پڑھی لکھی خاتون شرعی شادی پر مُصر ہے تاکہ سادگی سے بیٹے کا گھر بس

جائے جبکہ لڑکی کی ماں جو ان پڑھ ہے وہ نمود و نمائش میں کوئی کمی نہیں چھوڑتی۔اس صورتِ حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ارد گرد کے لوگ اسے بے وقوف بناتے ہوئے خوب لوٹتے ہیں۔

شادی کی رسموں کا ذکر کرتے ہوئے رشیدۃ النساء ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالتی ہیں جس میں بیوہ کی جانے انجانے دل آزاری کی جاتی ہے۔لڑکی کی مہندی،مایوں اور باقی رسموں میں بطورِ خاص ایسی لڑکیوں کو نزدیک نہیں آنے دیا جاتا جو پہلے ہی سے اپنے کرب میں مبتلا ہو کر تنہا ہو جاتی ہیں۔

"جن کا سن بارہ برس،چودہ برس یا بیس پچیس ہی برس کا ہے کہ بیوہ ہو گئیں۔جب برس چھ مہینے ہو گئے تو بے چاریاں برادری کے خیال سے شادی میں شریک ہوئیں،اور وہاں یہ چھوت ہو گئی کہ دولہن کے کپڑوں کو بیوہ نہ چھوئیں تو ضرور ان کے دل میں یہ بات آئے گی کہ ہائے اگر ہم بھی سہاگن رہتے تو سب چیزوں کو اس وقت چھوتے دیکھتے،یہ تو صاف صاف ان کو بلا کر ان کے دلوں کو دکھ اور صدمہ دینا اور ان کے بھولے بسرے غم کو تازہ کرنا ہوا یا نہیں؟ کیسی مہمان نوازی ہے؟ یا تو لوگ بلائیں نہیں اور جو بلائیں تو اس قسم کے ٹونے ٹوٹکے سے مہمانوں کا دل نہ دکھائیں"(۱۷)

دولہا دلہن کی ماؤں کے درمیان ہونے والے مکالمے بھی مصنفہ کا نقطہ نظر سمجھنے میں معاونت کرتے ہیں کہ محض دکھاوے کی خاطر اپنے آپ کو مشکلات میں نہ پھنسایا جائے۔

"امتیاز الدین کی ماں: جی نہیں! دولہنیں تو مکہ شریف میں بھی سنواری جاتی ہیں اور مہمانوں کو بلانا،ان کو کھلانا تو گناہ نہیں ہے مگر ہاں سودی روپیہ لے کر یا حیثیت سے زیادہ خرچ کرنا البتہ منع ہے"(۱۸)

اسی طرح وہ کہانی میں صرف عورت پر ہونے والے اثرات کا ہی جائزہ نہیں لیتیں بلکہ سود پر لیا قرض اور اس کے خوف ناک نتائج کو بھی سامنے لاتی ہیں۔وہ ان غریب رشتہ داروں کی بھی فکر کرتی ہیں جو ان خواہشات کو اپنی کم مائیگی کی وجہ سے پورا نہیں کر سکتے۔

"جس کی حیثیت کم ہوتی ہے وہ بھی کسی نہ کسی طرح سے فکر کر کے کپڑا کرتا ہے،----- آپ خوب جانتی ہیں تو اب سینکڑوں روپے سود کے مہاجن کو دینے پڑتے ہیں۔ابھی ایک قرض نہیں ادا ہوا تھا کہ دو چار شادیاں برادری میں ہوئیں،بدلہ کرنا تو ضروری تھا اور قرض پر قرض ہوا،چلئے ساری ملکیت اور جائیداد جو روزی کا ٹھیکرا تھا،سود کھانے والوں کے قرض میں کوڑیوں کے مول بک گیا،نیلام ہو گیا،ٹکے ٹکے کو محتاج ہو گئے،یہ برائی کیا تھوڑی ہے؟ مگر کوئی سمجھتا ہی نہیں ہے،یہ رسم تو تباہی کی جڑ ہے،کہیں میل محبت میں ایک،ایک کو تباہ بھی کرتا ہے اور اس میں تباہی رکھی ہے۔دوسری برائی یہ ہے کہ غریب اہل برادری کو اس بات کا صدمہ ہوتا ہے کہ میرے پاس اگر روپے ہوتے تو میں کپڑا کرتی،برادری میں شرمندگی نہ ہوتی"(۱۹)

رشیدۃ النساء کا ناول 'اصلاح النساء' خواتین کے ادب کی اولین مثالوں میں سے ایک ہے۔اس ناول میں خواتین کے مسائل کو خواتین کرداروں کے ذریعے ہی متشکل کرنے کی کوشش کی ہے۔ناول کی ہیروئین بسمہ اللہ کی زندگی میں تعلیم

ہی مثبت تبدیلی لانے کا سبب بنتی ہے۔ناول کا پلاٹ مربوط ہے لیکن اس میں بھی نذیر احمد کی طرح اصلاحی اور تبلیغی رجحان کہیں کہیں نمایاں ہونے لگتا ہے لیکن کہانی کے چھوٹے بڑے کردار اپنے مختصر اور طویل مکالموں کے ساتھ اس تبلیغی رنگ کو کہانی سے الگ نہیں ہونے دیتے۔ مصنفہ، سرسید احمد خان اور مولانا اشرف تھانوی کی طرح خواتین کو ایک الگ خانے میں رکھنے کی قائل نہیں بلکہ عورت تعلیم کے ذریعے زندگی کے کئی افق کھول سکتی ہے جہاں سے روشنی کی ایک کرن جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں کو شکست دے کر ذہنوں کو تابناک کردے۔اس ناول کو خواہ اس کی وجۂ تصنیف کوئی بھی ہو اسے بیسویں صدی کے جدید فکری رویوں کا اعلامیہ کہا جا سکتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی

ا۔ زاہدہ حنا، ''رشندری، رشیدہ اور رقیہ کا خواب''، مشمولہ اصلاح النسا، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، انڈیا، ص۲۲۷

۲۔ مولوی محمد امین زبیری، ''مسلم خواتین کی تعلیم'' ادارۂ تصنیف و تالیف، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس۔کراچی، ص۷۱

۳۔ زاہدہ حنا، ''رشندری، رشیدہ اور رقیہ کا خواب''، مشمولہ ''اصلاح النساء''، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، انڈیا، ص۲۲۲

۴۔ رشیدۃ النساء، ''اصلاح النساء''، ایضاً، ۱۶

۵۔ ایضاً، ص۲۱

۶۔ ایضاً، ص۱۹

۷۔ ایضاً، ص۲۰

۸۔ ایضاً، ص۵۰

۹۔ ایضاً، ص۵۱

۱۰۔ ایضاً، ص، ۲۵

۱۱۔ ایضاً، ص۳

۱۲۔ ایضاً، ص۳۵،۳۴،۳۴

۱۳۔ ایضاً، ص۶۷

۱۴۔ ایضاً، ص۳۵

۱۵۔ ایضاً، ص۶۷

۱۶۔ ایضاً، ص۵۷

۱۷۔ ایضاً، ص ٦٦

۱۸۔ ایضاً، ص ٦٧

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۳ تا ۵۴

حواشی

۱: اصلاح النساء کی مصنفہ '' رشیدۃ النساء'' کا تعلق بہار سے تھا۔ وہ ۱۸۵۵ء میں پٹنہ میں پیدا ہوئیں، ان کے والد شمس العلماء خان بہادر سید وحید الدین صدر اعلیٰ تھے۔ وہ بڑے علم دوست اور جدید خیالات کے آدمی تھے۔ آپ کے بھائی شمس العلماء نواب سید امداد امام اثرؔ مصنف کاشف الحقائق، اپنے دور کے مشہور عالم، شاعر اور نقاد تھے۔

۲: شادی کی ان رسموں کا احوال جو ''اصلاح النساء'' میں تفصیل سے پیش کی گئیں۔)

''ایک کشتی میں دولہا کے لیے مانجھے کا جوڑا تھا، زرد رنگ کا انگر کھا، مشروع کا پائجامہ، زرد کرتا، سرخ رنگ کا رومال جس کے چاروں طرف گوٹا لگا ہوا، زر کی ٹوپی، زر کا جوتا بھاری کام کا، یہ سب چیزیں ایک کشتی میں تھیں اور پھول، چنگیر طرہ، بدھی اور ہار تھے، یہ سب چیزیں نہایت عمدہ تورہ پوش سے ڈھکی ہوئی تھیں، دوسری کشتی میں ایک تھالی چاندی کی، اس تھالی میں سات پینڈیاں، اس میں ایک زرد رنگ کا کنگنا تھا، کچھ کارچوبی کا کام کیا ہوا جو اسپند ورائی دے کر بنایا گیا تھا اور اسی کشتی میں ایک دوسری تھالی میں سات بیڑے پان کے ورق نقرہ لگے ہوئے اور ایک کپی میں تیل چمبیلی کا جس کے منہ پر سرخ کپڑا گوٹا لگا ہوا بندھا تھا۔ یہ سب چیزیں رکھ کر ایک تورہ پوش کشتی پر ڈال دیا'' (ص۔ نمبر ۴۱)

'' چاندی کی چوکی جو مانجھے کے ساتھ آئی تھی، فرش پر بچھائی گئی۔ اس پر امتیاز الدین کو لوگوں نے لا کر بٹھایا۔ امتیاز الدین شرمائے وسر جھکائے رہا، ادھر ادھر دیکھنا بھالنا کیسا، صرف نظر نیچی کیے بیٹھا رہا، کپڑے اور پینڈی کی کشتیاں لا کر رکھی گئیں، جو کپڑے آئے تھے وہ پہنائے گئے، پھول کی بدی اور ہار تو گلے میں ڈالا گیا، مگر طرہ کھونسنے کی جگہ نہ تھی، جوڑے کے ساتھ فقط ٹوپی آئی تھی، اس لیے طرہ صرف سر سے چھلا کر رکھا دیا گیا۔ اب مکھن مصری پینڈی کھلانے کا ٹوناگانا شروع کیا اور ایک رشتہ کی سالی نے ساتوں پینڈیوں میں سے ذرا ذرا اپنے ہاتھ سے دولہا کو دکھلایا اور کئی مرتبہ ڈھکایا، اس پر سب کو خوب ہنسی آئی۔ دو چار منٹ تک سمدھنیں ادھر کی ماما اصیلیں ہنستی رہیں، بعد اس کے مکھن نے بیڑا کھلانا اور ٹوناگانا شروع کیا، یہاں تک کہ ساتوں بیڑے کھلائے گئے اور ہر بیڑے کے ساتھ ایک نیا ٹونا گایا گیا۔ امتیاز الدین کا دم ناک میں آگیا تھا'' (ص نمبر۔ ۴۴)

''اس وقت کی ایک رسم یہ ہے کہ پھوبھی چوٗلھا پھونکتی ہے اور پوٗلھا پھنکائی کا نیگ لیتی ہے اور یہ حق پھوپھی کا ہے۔ اس کا دعویٰ شادیوں میں پھوپھی کو ہوتا ہے پھوپھیاں جائیداد یا بھاری زیور یا زیادہ روپے مانگتی ہیں اور دولہا دولہن کے ماں باپ کی طرف سے کم مقدار قبول کی جاتی ہے، آخر کار مہمانوں کو بیچ میں پڑ کر طے کرنے کی نوبت آتی ہے اور کہیں یہ جھگڑا آسانی سے بھی طے ہو جاتا ہے'' (ص نمبر۔ ۴۹)

''بسم اللہ کی ماں نے کہا کہ ارے لوگو دولہن کی پھوپھی کہاں ہے، ان کو بلاؤ، ذرا پھوچھو تو کہ وہ نیگ میں کیا مانگتی ہیں مہمانوں نے ان کو آکر گھیرا، دو چار بیبیوں نے کہا آپ چل کر فقط کھڑی ہو جائیے۔ ماما اصیلیں چولھا پھونک لیویں گی،

بھاوج کو رنج دینے کا کیا فائدہ"(ص نمبر۔۵۰)

"پہلے ایک رکابی پر جناب رسول مقبول ﷺ کی نیاز ہوئی، بعد اس کے پانچ رکابیاں رکھ کر پنجتن پاک کی نیاز دی گئی پھر بسم اللہ کے دادا پر دادا اور جتنے داد یہالی بزرگوار تھے جہاں تک نام ہر ایک کا معلوم تھا ایک ایک رکابی سامنے رکھ کر سب فاتحہ ہوا، اس کے بعد نادر باہر گئے تو کپڑے کے پٹارے شامیانے کے نیچے لائے گئے۔ سب سے پہلے کریم النساء بلائی گئیں۔ جب وہ آئیں تو بسم اللہ کی ماں نے اپنی پھوپھی سے کہا ان کو آپ کپڑے پہنایئے، آپ سے عذر و معذرت کچھ نہ کریں گی، میں جو کہوں گی تو بہت اعتراض کریں گی اور ہزاروں باتیں بنائیں گی"(ص نمبر۔۵۳)

"بعد اس کے پونیوں کو یعنی مہترانی، دھوبن، تیلن، حجامن، کنجڑن، پن بھرن کو کپڑے ملے۔ مالن، چوڑی والی، کمہارن کے کپڑے نکال کر علیحدہ رکھ دیئے گئے۔ بعد اس کے کشتیاں منگائی گئیں ایک کشتی میں کریم النساء کے میاں کا جوڑا رکھا گیا جس میں مشروع کا پائجامہ چکن کا کرتا، سبز گرنٹ کا بانکڑی ٹکا ہوا انگرکھا، زری ٹوپی، کامدانی کا رومال، اوڑھنے کا اور دلی وال پر متن جاتا تھا اور دوسری کشتی میں میر واعظ اور نادر کے جوڑے تھے۔ لونڈیوں نے کشتیاں اٹھائیں اور گاتی ہوئی باہر گئیں۔ مردانے مکان میں، جہاں میر واعظ صاحب اور میاں امیر کریم النساء کے شوہر اور محمد معظم تھے۔ کشتیاں سامنے لے جا کر رکھی گئیں، پہلے تو روپوش اس کشتی سے اٹھایا گیا جس میں میاں امیر کے کپڑے تھے۔ ہر ایک کپڑے کو دیکھ کر میاں امیر نے ہنس کر کہا کہ یہ میرے کس مصرف کے ہیں، میں نہ ایسے کپڑے پہنتا ہوں نہ ایسا جوتا پہنتا ہوں، میں تو ایسے لباس میں ایک سانگ بن جاؤں گا"(ص نمبر۔۵۵)

"ہندوؤں کے لیے زرد دھوتی، سفید مرزائی اور گلابی پگڑی اور مسلمانوں کے لیے انگرکھا، پائجامہ، ٹوپی دوپٹہ تھا۔ ڈیوڑھی اور دیہات کے نوکروں کو تقسیم کر دیئے گئے۔ ایک مرغی پٹ اور دو مرغ سرخ رنگ کے منگوائے گئے۔ سفید مرغ غازی میاں کے نام سے اور ایک لال مرغ میاں جلال کے نام سے اور ایک میاں ہٹیلے کے نام سے ذبح ہوا"(ص نمبر۔۵۶)

"پھر ماما اصیلوں میں سے سات عورتیں ایسی چنی گئیں جن کا دوسرا نکاح نہیں ہوا تھا اور سہاگن بھی تھیں۔ پہلے ایک بانس کے سوپ میں ارواچاول، دوب، ہلدی، بدھنی رکھی گئی پھر گھڑے اور بدھنی میں کنگنا باندھ کر ایک ماما کے سر پر سوپ اور چھ ماماؤں کر سر پر چھ گھڑے رکھ کر پیچھے ایک ماما کھڑے کی گئی اور لال کپڑا ان گھڑوں اور سوپ پر اوڑھایا گیا۔ یہ ماماؤں کی قطار حضرت بی بی کا گیت گاتی ہوئی باہر نکلی۔

باہر سے باجے والے آگے آگے باجا بجاتے ہوئے پیچھے قطار والی مامائی ان کے پیچھے اور بہت سی مہمانوں کی مامائیں، لونڈیاں، محلے ٹولے کی عورتیں ساتھ ساتھ گاتی ہوئی دریا کے کنارے گئیں اور گھڑوں میں صحنک کا پانی دریا سے لے کر گھر میں شامیانہ کے نیچے لائیں۔ سوپ اور گھڑوں کو سہاگنوں نے اتارا، اس پانی سے آدھ من چاول دھوئے گئے۔ دستور کے موافق ڈفالی کے ہاں ٹکے روز پر ڈھول منگایا جا چکا تھا"(ص نمبر۔۵۸)